تسمیہ کی ترکیب نحوی اور ایک لطیف نکتہ

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم میں ''حرف باء'' جار ہے'' اسم'' مجرور اور مضاف' ''لفظ اللہ'' مضاف الیہ اور موصوف ہے' لفظ'' الرحمٰن الرحیم'' دونوں یکے بعد دیگرے موصوف یعنی اللہ کی صفات ہیں۔ موصوف (اللہ) اپنی دونوں صفات (الرحمٰن الرحیم) کے ساتھ مل کر اسم کا مضاف الیہ بن گیا اور مضاف (اسم) اپنے مضاف الیہ (اللہ الرحمٰن الرحیم) سے مل کر جار یعنی ''حرف باء'' کا مجرور ہوگیا۔ اب اس حرف باء (جار) کا ایک متعلق ہے جو فعل محذوف ہے۔ وہ یہاں **أشرع' أبدا یا أقراء** وغیرہ ہوسکتا ہے۔ چنانچہ جار و ''مجرور'' اور ''فعل محذوف'' جس میں فاعل بھی ہے۔ سب مل کر ''جملہ فعلیہ خبریہ'' پر منتج ہو گئے۔ اس کی دوسری صورت یہ بھی ہے کہ یہاں فعل محذوف صیغہ امر **أبدا یا أقرا** کو مانا جائے۔ اس طرح تسمیہ ''جملہ فعلیہ انشائیہ'' قرار پائے گا۔

یہاں ایک لطیف نکتہ قابل غور ہے کہ تسمیہ کا ''جملہ فعلیہ خبریہ یا جملہ فعلیہ انشائیہ'' ہونا فعل محذوف کی نوعیت پر مبنی تھا۔ اگر فعل محذوف کی بجائے زیادہ توجہ حرف باء کے مفہوم اور اس کی نوعیت کے تعین پر کی جائے جیسے کہ بعد میں بیان کیا جائے گا تو تسمیہ کا کلام ہر صورت میں ''دعائیہ'' قرار پا جاتا ہے کیونکہ یہاں حرف باء تین حالتوں میں سے یقیناً کسی نہ کسی ایک حالت کا حامل ہے اور وہ ہیں۔ ''الصاق و مصاجت'' ''استمداد و استعانت'' اور ''تبرک و تیمن'' لہذا ''باء'' مذکورہ بالا میں سے جس حالت پر بھی دلالت کرے۔ کلام تسمیہ ایک ''دعا'' بن جاتی ہے اور یہی مقصود الٰہی ہے۔

تسمیہ کی شرعی حیثیت:

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم کے الفاظ کو اصطلاح میں ''تسمیہ'' کہا جاتا ہے۔ یہی تسمیہ ایک آیت کے حصے کے طور پر قرآن حکیم کی سورۃ النمل میں وارد ہوا ہے۔ اس لحاظ سے یہ بالاتفاق حصہ قرآن بھی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اِنَّهٗ مِنۡ سُلَيۡمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ O (النمل' ۲۷:۳۰)	بے شک وہ (خط) سلیمان کی جانب سے (آیا) ہے اور وہ اللہ کے نام سے شروع (کیا گیا) ہے جو بے حد مہربان بڑا رحم فرمانے والا ہے O

آئمہ فقہ میں سے شوافع اسے سورۃ الفاتحہ کا جزو قرار دیتے ہیں۔ جب کہ بعض علماء ہر سورت سے پہلے بسم اللہ وارد ہونے کی بناء پر سوائے سورۃ برات کے اسے ہر سورت کا جزو تسلیم کرتے ہیں۔ ان میں ابن عباسؓ ابن عمرؓ ابن زبیرؓ ابو ہریرۃؓ اور تابعین میں سے عطاءؒ طاؤسؒ سعید بن جبیرؒ مکحولؒ اور زہریؒ وغیرہم کے اسماء بیان کیے جاتے ہیں۔ امام عبداللہ بن مبارکؒ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ سے بھی ایک قول اسی طرح منقول ہے۔ قول معروف اور مذہب مختار یہ ہے کہ بسم اللہ قرآن کا حصہ ہے۔ لیکن سورۃ الفاتحہ یا دوسری سورتوں کا جزو نہیں بلکہ ہر سورت سے پہلے اسے محض امتیاز وانفصال اور تیمن وتبرک کے لیے بیان کیا گیا ہے۔ عبداللہ بن عباسؓ سے اسناد صحیح کے ساتھ مروی ہے:

كان المسلمون لايعرفون انقضاء السورة، (وفى رواية لايعرفون فصل السورة) حتى تنزل بسم الله الرحمن الرحيم فاذا نزلت عرفوا ان السورة قد انقضت، وفى رواية ان السورة قد ختمت واستقبلت اوابتداء ت سورة اخرى۔

مسلمانوں دو سورتوں کے درمیان فرق و انفصال کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ چنانچہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے نازل ہونے سے ایسی حد فاصل قائم ہوئی کہ لوگوں کو اس کے ذریعے ہر ایک سورت کے شروع ہونے یا ختم ہونے اور دوسری کے شروع ہونے کی معرفت حاصل ہوگئی۔

۱۔ سنن ابی داؤد، ۱:۱۲۲، کتاب الصلاۃ، باب من جهر بها، رقم: ۷۸۸

۲۔ السنن الکبری للبیهقی، ۲:۴۳

۳۔ المستدرک للحاکم، ۱:۲۳۱، ۲۳۲، رقم ۸۴۵، ۸۴۶۔

مدینہ، بصرہ اور شام کے قراء و فقہاء بھی اسی قول کے موید ہیں کہ ''بسم اللہ'' ''سورۃ النمل'' میں وارد ہونے کے اعتبار سے ایک مرتبہ تو قرآن کی مستقل آیت ہے۔ لیکن باقی تمام سورتوں سے اس کا ورود محض علامت فصل کے طور پر ہے تاکہ اس کے ذریعے دو متصل سورتوں کے درمیان واضح فرق کا پتہ چل جائے۔ امام ابوحنیفہؒ امام مالکؒ امام سفیان ثوریؒ امام احمد بن حنبلؒ امام اوزاعیؒ وغیرہم کا مذہب بھی یہی ہے۔

نماز میں قراءت تسمیہ کا حکم:

تسمیہ کی شرعی حیثیت کے تحت تسمیہ کا سورہ فاتحہ کا حصہ نہ ہونا اس امر سے بھی مترشح ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ جہری نمازوں میں قراءت بالجہر کا آغاز ''الحمد للہ رب العالمین'' سے

کرتے تھے۔ بسم اللہ کی قرات جہراً نہ فرماتے تھے۔ اس سلسلے میں چند احادیث ملاحظہ ہوں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم وابابکر و عمر و عثمان کانوا یفتتحون القراۃ بالحمد للہ رب العلمین وزاد مسلم لایذکرون بسم اللہ الرحمن الرحیم فی اول قرأۃ ولا فی آخرھا

سنن دارمی میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ جہری قرات کا آغاز الحمدللہ سے فرمایا کرتے تھے صحیح مسلم کے مزید الفاظ یہ ہیں کہ پہلی اور دوسری مرتبہ دونوں قراتوں میں (جہرا) بسم اللہ نہیں پڑھتے تھے۔

۱۔ صحیح مسلم، ۱:۲۷۱، کتاب الصلاۃ، رقم: ۵۲

۲۔ مسند احمد بن حنبل، ۳:۱۰۱، ۱۱۴

۳۔ سنن الدارمی، ۱:۳۰۰ مطبوعہ دارالقلم دمشق

۴۔ سنن النسائی، ۲:۹۷، رقم: ۹۰۲

سعید بن منصور سنن میں ابووائلؓ سے اسناد صحیح کے ساتھ روایت کرتے ہیں۔

کانوا یسرون التعوذ والبسملۃ فی الصلٰوۃ۔

صحابہ کرام نماز میں تعوذ اور تسمیہ آہستہ پڑھتے تھے۔

حضرت انسؓ اسنادِ صحیح کے ساتھ روایت کرتے ہیں۔

قال صلیت خلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وابی بکر وعمر وعثمان (رضی اللہ عنھم) فلم أسمع أحدا منھم یجھرء بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

(سنن نسائی، ۲:۹۹، رقم: ۹۰۷)

انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ابوبکرؓ عمرؓ اور عثمانؓ کے پیچھے نماز پڑھی ہے۔ میں نے ان میں سے کسی کو بھی جہراً بسم اللہ پڑھتے نہیں سنا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکی دور میں ابتداًء دوران نماز بسم اللہ جہراً پڑھتے تھے۔ اس پر مشرکین مکہ استہزاء کرتے کیونکہ وہ ''مسلیمہ کذاب'' کو رحمٰن کہتے تھے اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سن کر وہ طعنہ دیتے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اہل یمامہ کے معبود ''مسلیمہ کذاب'' کی طرف بلاتے ہیں۔ اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کو بسم اللہ کی قرأت آہستہ کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

فامر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باخفائھا فما جھر بھا حتیٰ مات۔

(طبرانی)

لہذا حضور ﷺ نے حکم صادر فرمایا کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پوشیدہ پڑھا کرو، پھر تا وقتِ وفات کبھی نماز میں بسم اللہ پکار کر نہیں پڑھی۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے۔

فلما نزلت ھذہ الایة أمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لایجھر بھا۔

(طبرانی)

جب آیت بسم اللہ نازل ہوئی تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ بسم اللہ بلند آواز سے نہ پڑھی جائے۔

اسی طرح صحیح بخاری، صحیح مسلم اور طبرانی کے علاوہ مصنف ابن ابی شیبہ، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، ابن خزیمہ، اور بیہقی وغیرہ متعدد کتب حدیث میں اس امر کی صراحت موجود ہے کہ تسمیہ کی قرات سورہ فاتحہ یا کسی اورسورت کے حصے کے طور پر نہیں بلکہ الگ حیثیت سے کی جاتی تھی۔ اگر یہ حصہ سورۃ فاتحہ ہوتی تو یقیناً اس کی قرات بھی اس کے ساتھ بلند آواز سے کی جاتی۔ جن روایات میں بسم اللہ کی قرات کا دوران نماز بلند آواز سے ہونا مذکور ہے وہ مکی دور کے اوائل ایام سے متعلق ہیں۔ لیکن بعد میں صراحت کے ساتھ حضور اکرم ﷺ نے پکار کر پڑھنے کی ممانعت فرمادی۔ لہذا التسمیہ کا نماز میں پڑھا جانا تلاوتِ قرآن کے آغاز وافتتاح کے طور پر ہے۔ کیونکہ حمد وثناء کے بعد جب سورہ فاتحہ کی قرات شروع ہوتی ہے تو یہی دوران نماز تلاوت قرآن کا آغاز ہے اور یہاں بھی یہ حکم ہے کہ تلاوت قرآن کا آغاز پہلے تعوذ (**اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم**) اور پھر تسمیہ (**بسم اللہ الرحمن الرحیم**) سے کیا جائے۔

تسمیہ سے ہر کام کے آغاز کا حکم (تاریخی پس منظر):

شریعتِ اسلامیہ میں ہمیشہ سے یہی تعلیم دی جاتی رہی ہے کہ ہر جائز اور مشروع کام کا آغاز خدا کے نام سے کیا جائے۔

۱۔ جب نوح علیہ السلام نے طوفان سے بچاؤ کے لیے اِذنِ الٰہی کے مطابق کشتی تیار کر لی اور اپنے ساتھیوں کو اس میں سوار کرلیا تو کشتی چلانے سے قبل فرمایا:

وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖهَا وَمُرْسٰهَا اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌO

(ھود،۱۱:۴۱)

اور نوح نے کہا تم لوگ اس میں سوار ہو جاؤ، اللہ ہی کے نام سے اسکا چلنا اور اسکا ٹھہرنا ہے بے شک میرا رب بڑا ہی بخشنے والا نہایت مہربان ہےO

۲۔ اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ صبا کو جو تبلیغی خط لکھا۔ اس کا آغاز بھی انہی مبارک

کلمات سے کیا گیا تھا۔

اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔

(النمل، ۲۷:۳۰)

بے شک وہ (خط) سلیمان کی جانب سے (آیا) ہے اور وہ (اللہ کے نام سے شروع (کیا گیا) ہے جو بے حد مہربان بڑا رحم فرمانے والا ہے o

۳۔ عہد عیسوی میں بھی ان کلمات کی برکات و تاثیرات کا پتہ چلتا ہے۔ اسرائیلیات میں ایک روایت مذکور ہے کہ عیسٰے علیہ السلام کا ایک قبر پر گزر ہوا۔ آپ نے فرشتوں کو دیکھا کہ وہ صاحب قبر پر عذاب کر رہے ہیں۔ جب دوسری مرتبہ گزر ہوا تو دیکھا کہ رحمت کے فرشتے نور کے طبق اس پر پیش کر رہے ہیں۔ آپ کو بہت تعجب ہوا، نماز پڑھی اور کشف حال کے لیے دعا کی۔

فاوحی الله تعالٰی إلیه: یا عیسٰی، کان هذا العبد عاصیاً و مذمات کان محبوسا فی عذابی، وکان قد ترک إمراة حبلٰی فولدت ولدا وربته حتٰی کبر، فسلمته الٰی الکتاب فلقنة المعلم بسم الله الرحمن الرحیم فاستحییت من عبدی إن أعذبه بناری فی بطن الأرض وولده یذکر إسمی علی وجه الارض۔

(التفسیر الکبیر، ۱:۱۷۲)

پس اللہ تعالٰی نے وحی کی انکی طرف کہ اے عیسٰیؑ یہ بندہ گناہ گار تھا اور اپنی موت کے دن سے میرے عذاب میں گرفتار تھا۔ وقتِ مرگ اس کی بیوی حاملہ تھی۔ جس نے بعد میں ایک بچہ پیدا کیا۔ اس کی ماں نے اسے پالا اور معلمِ دین کے سپرد کر دیا۔ اس معلم نے جب اس بچے کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھائی تو ہم کو شرم آ گئی کہ اس کا باپ قبر میں عذاب میں مبتلا رہے اور اس کا بیٹا زمین پر ہمارے نام کا ذکر کرے پس ہم نے اس کو بخش دیا۔

۴۔ اسی طرح حضور ﷺ نے بھی ہر کام سے پہلے بسم اللہ پڑھنے کا حکم صادر فرمایا۔ چنانچہ یہ حکم بعض معاملات میں ''واجب'' کا درجہ رکھتا ہے۔ بعض میں ''سنت'' کا اور بعض میں ''مستحب'' کا۔ قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا:

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ۔

(الانعام، ۶:۱۱۸)

سوتم اس (ذبیحہ) سے کھایا کرو جس پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام لیا گیا ہو۔

اس سے آگے مزید حکم دیا گیا۔

وَمَالَكُمْ اَلَّا تَاكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَاسْمُ اللهِ عَلَيْهِ۔
(الانعام، ٦:١١٩)

اور تمہیں کیا ہے کہ تم (ذبیحہ) سے نہیں کھاتے جس پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام لیا گیا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

کل أمر ذی بال لایبداء فیه بسم الله الرحمن الرحیم فهو أجزم۔

جو کام بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع نہ کیا جائے وہ ناقص رہتا ہے یعنی اپنے کمال کو نہیں پہنچ سکتا۔

١۔ سنن ابن ماجہ، ١:٦١٠، رقم:١٨٩٤
٢۔ المعجم الکبیر، ١٩:٦٨، رقم:١٤١
٣۔ کنز العمال، ١:٥٥٥، رقم:٢٤٩١

اس حدیث کا مفہوم اس طرح سمجھیں جیسے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

لا وضوء لمن لم یذکر اسم الله علیه۔

اس شخص کا وضو نہیں جس نے اس پر بسم اللہ نہ پڑھی۔

مسند احمد بن حنبل، ٢:٤١٨
مسند احمد بن حنبل، ٣:٤١
مسند احمد بن حنبل، ٤:٧٠
مسند احمد بن حنبل، ٥:٣٨١
مسند احمد بن حنبل، ٦:٣٩٧

اس کا مطلب ہرگز نہیں کہ بسم اللہ کے نہ پڑھنے سے وضو کی فرضیت ہی ناقص رہ جاتی ہے بلکہ فرض تو ادا ہو جاتا ہے۔ لیکن سنن و مستحبات کی شمولیت سے جو کمال نصیب ہوتا ہے اس سے محروم رہ جاتا ہے۔ اسی طرح ہر فعل جو بغیر بسم اللہ کے شروع کیا جائے۔ ممکن ہے کہ دینوی لحاظ سے مطلوبہ نتائج کے حصول میں تو ناکام نہ ہو لیکن اپنے اجر و ثواب کے اعتبار سے عنداللہ کامل نہ ہوگا۔ اسی روحانی کمال اور نقص کی طرف متذکرہ بالا حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

آپ غور فرمائیں کہ کلام الٰہی جو سراسر خیر و برکت ہے۔ جب اس کے پڑھنے سے بھی پہلے بسم اللہ کا پڑھنا بطور شرط لازم ہے تو دیگر امور حیات سے قبل تسمیہ کا پڑھا جانا کس قدر ضروری ہوگا۔ آنحضرت ﷺ کی اپنی عملی مداومت بھی اسی اصول پر تھی۔

٥۔ حتیٰ کہ باری تعالیٰ نے خود اپنے کلام مبارک کے نزول کے آغاز و افتتاح کے لیے جو کلمات منتخب فرمائے وہ بھی ''تسمیہ'' کی نوعیت کے تھے۔ غار حرا میں گونجنے والی سب سے پہلی قرآنی صدا بھی یہ تھی۔

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ O (العلق، ۹۶:۱)

اے محمد آپ پڑھیے اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے آپ کو اور سب کو پیدا کیا O

گویا آداب قرات میں سب سے پہلا قرینہ بسم اللہ سے شروع کرنا تھا اور اسی قرینہ کے مطابق نبی اکرم ﷺ سے قرات کا آغاز کرایا گیا۔ مفسرین عام طور پر بسم اللہ کو معنوی وسعت کے اعتبار سے تمام قرآنی علوم کی جامع قرار دیتے ہیں۔ امام فخر الدین رازیؒ فرماتے ہیں۔

کل العلوم مندرج فی الکتب الاربعة وعلومها فی القرآن، وعلوم القرآن فی الفاتحة وعلوم الفاتحة فی (بسم الله الرحمن الرحیم) و علومها فی الباء من بسم الله

(تفسیر کبیر، ۹۹:۱)

تمام علوم و معارف چار الہامی کتابوں میں درج کیے گئے ہیں اور ان کے تمام علوم قرآن میں اور قرآن کے تمام علوم سورۃ الفاتحہ میں اور سورۃ الفاتحہ کے تمام علوم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں، اور اس کے تمام علوم بائے بسم اللہ میں۔

چنانچہ تسمیہ کی ہمہ پہلو تفسیر اسی طرح ناممکن ہے جیسے پورے قرآن کی۔ تاہم یہاں اس کے چند گوشوں پر کچھ روشنی ڈالی جاتی ہے۔

حذفِ فعل کی حکمت:

قرآن میں تسمیہ کا بیان اس طرح ہے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اللہ کے نام سے (شروع کرتا ہوں) جو نہایت مہربان رحمت والا ہے۔ یہاں ایک خاص امر قابل توجہ ہے کہ قرآنی عبارت میں ''شروع کرتا ہوں'' کے لیے کوئی لفظ یا کلمہ استعمال نہیں ہوا۔ ترجمے میں یہ الفاظ معنوی طور پر از خود تصور کیے جاتے ہیں۔ درحقیقت قرآن کے اس انداز میں خاص حکمت پنہاں ہے۔

اگر قرآن ''شروع کرتا ہوں'' کے الفاظ اپنی عبارت میں استعمال کرتا تو اس کی صورت یہ ہوتی أبداء... أشرع یا أبداء (میں آغاز کرتا ہوں)۔ ان میں ہر لفظ فعل اور فاعل دونوں کا جامع ہوتا۔ عام طور پر یہی عربی ادب کا اسلوب ہے کہ فعل اور فاعل اکٹھے ہوا کرتے ہیں۔ اب اس کی دو ہی صورتیں ممکن تھیں۔

۱۔ ایک یہ کہ أبدا وغیرہ کا لفظ بسم اللہ سے پہلے استعمال کیا جاتا۔

۲۔ دوسری یہ کہ ایسا لفظ بسم اللہ کے بعد استعمال ہوتا۔ لیکن قرآن نے اسے ہر صورت میں ہی محذوف اور مضمر کر دیا۔ اس کی چند حکمتیں ہیں۔ ان حکمتوں کے بیان سے قبل یہ اصول ذہن نشین ہو جانا چاہیے کہ بعض اوقات عربی عبارت میں ایسے حروف استعمال ہوتے ہیں جن سے پہلے کوئی فعل محذوف تصور کیا جاتا ہے یعنی اس کا شمار معنی میں تو ہوتا ہے لیکن عبارت میں نہیں۔ جیسا

کہ قرآن مجید میں اس کی مثال واضح ہے:

اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ۔ (البقرۃ، ۲:۳۰)

اور (وہ وقت یاد کریں) جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا۔

یہاں قاعدہ نحو کے مطابق اذ سے پہلے اُذْکُرْ فعل مخدوف ہے۔ جس کا معنی ہے ''یاد کرو'' جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا۔ اسی طرح حرف باء جس سے تسمیہ کا آغاز ہو رہا ہے' سے بھی پہلے ایک فعل مخدوف ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس فعل کو مخدوف رکھنے میں کیا حکمت پوشیدہ ہے۔

پہلی حکمت:

اگر ابداء یا اس جیسا کوئی لفظ بسم اللہ سے پہلے وارد ہوتا تو یہ امر واضح تھا کہ اس کا فاعل وہ شخص خود ہی ہوتا جو قرآن کی تلاوت یا کسی دوسرے کام کا آغاز کر رہا تھا۔ ابداء کا فاعل اللہ تعالیٰ کسی لحاظ سے بھی نہ ہو سکتا تھا۔ باری تعالیٰ چونکہ تعلیم یہ دینا چاہتے تھے کہ قرآن کی تلاوت ہو یا کوئی اور جائز کام' اس کا آغاز اللہ کے نام سے ہی ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس مخصوص ادب معاشرت کی تعلیم کلمات تسمیہ کے ذریعے دی جا رہی تھی۔ اس لیے یہ ہرگز مناسب نہ تھا کہ خود ان ہی کلمات کا آغاز اللہ کے نام کے علاوہ کسی دوسرے کے ذکر سے ہوتا۔ چنانچہ اس مخصوص ادب اور ضابطہ عمل کی تعلیم بھی اسی انداز سے دی گئی کہ اظہار مدعا کا آغاز بھی براہ راست اللہ ہی کے ذکر سے ہو۔ کسی اور کے ذکر سے نہیں۔ کیونکہ اسی طرح کمال برکت کا حصول ممکن ہے۔

دوسری حکمت:

صیغہ متکلم واحد کا استعمال ہوتا یا جمع کا' دونوں صورتوں میں قائل اپنا اور اپنے فعل کا ذکر اسم باری تعالیٰ پر مقدم کرتا۔ یہ امر ادب واحترام کی اعلیٰ منزلوں کے منافی تھا۔ یہ لحاظ عام گفتگو میں بھی رکھا جاتا ہے کہ اگر قائل کسی کام کے ضمن میں اپنے علاوہ دوسرے افراد کا ذکر بھی مشترکہ طور پر کرنا چاہتا ہو تو پہلے دوسروں کا نام لیا جاتا ہے اور آخر میں متکلم اپنا نام لیتا ہے کیونکہ یہ آداب تہذیب کلام کا حصہ ہیں۔ اپنا نام لینا معیارِ لطافت کے خلاف ہے۔ اسی طرح کسی کام میں افضل پر مفضول کی سبقت بھی خلاف ادب تصور کی جاتی ہے۔ اس کی ایک مثال قرآن حکیم سے بیان کی جاتی ہے کہ بعض لوگوں نے عہد رسالت میں عیدالاضحیٰ کے دن آنحضرت ﷺ سے پہلے قربانی کر دی اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَاتُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَىِ اللهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوْاللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌO	اے ایمان والو! تم اللہ اور رسول سے (کسی معاملہ میں) سبقت نہ کیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو بے شک اللہ سننے والا اور خوب جاننے والا ہےO
(الحجرات' ۱:۴۹)	

اللہ تعالیٰ نے باوجود اس کے کہ ان کا عمل حکم الٰہی کی اطاعت پر مشتمل تھا اور وہ خون بھی محض رضائے الٰہی کی خاطر بہایا گیا تھا جو کہ خالصتاً عبادت تھا۔ لیکن ان سے خطا صرف یہ سرزد ہوئی کہ وہ عمل میں وقتی طور پر نبی اکرم ﷺ پر تقدم کر بیٹھے تھے۔ یہی بات اللہ تعالیٰ کو رسالت مآب ﷺ کی تعظیم و ادب کے منافی معلوم ہوئی۔ انہیں قربانیاں پھر سے کرنے کا حکم صادر کیا گیا اور آئندہ کے لیے حکماً اس اقدام کے امکان کو بھی ختم کر دیا گیا۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ بعض لوگ رمضان المبارک سے ایک دن قبل روزہ رکھنا شروع کر دیتے تھے اور اس طرح وہ آنحضور ﷺ پر تقدم کر بیٹھتے تھے۔ چنانچہ اس آیت کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ان کو حکماً منع فرما دیا۔ اس مثال کے ذریعے درحقیقت یہ بات واضح کرنا مقصود تھی کہ بعض اوقات تقدم خلافِ ادب تصور کیا جاتا ہے چنانچہ بسم اللہ میں جو کہ خود ہی سراسر ادب کی تعلیم ہے' اسی اصول کو لفظاً بھی ملحوظ رکھا گیا ہے تا کہ کلام میں بھی ادبِ الوہیت نظر انداز نہ ہو کیونکہ یہی کمالِ ایمان کی علامت ہے۔ ادب سے محروم شخص علم و عمل کی بے پناہ دولتوں کے باوجود لذت ایمان سے محروم رہتا ہے۔ اسی لیے ہر سطح پر جس قدر بھی ملحوظ رہے بہتر ہے۔ کلام میں اس قدر لفظی احتیاط اور حکمت و مصلحت انسانی کوشش کے باوجود پیش نظر نہیں رہ سکتی۔ یہ صرف کلام الٰہی کا اعجاز ہے جو بغیر تصنع کے ان حکمتوں پر دلالت کر رہا ہے۔

تیسری حکمت:

یہ حکمتیں تو اَبداء وغیرہ کے الفاظ بسم اللہ پر مقدم نہ کرنے میں مضمر تھیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کے نام سے پہلے کسی اور کا ذکر تو خلاف ادب تھا۔ اس لیے اسے محذوف رکھا گیا۔ مگر بعد میں بیان نہ کرنے میں کیا مصلحت پوشیدہ ہے۔ یہ امر ذہن نشین رہے کہ صاحب حکمت کا کوئی فعل حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ جب اُبداء یا اشراع کی صورت میں کسی کام کے شروع کرنے کا ذکر آئے گا تو اس میں فاعل خود متکلم کی ذات ہوگی۔ گویا متکلم تسمیہ کے ذریعے کسی نہ کسی فعل میں اپنے فاعل ہونے کا ذکر بھی ساتھ ہی کر رہا ہوگا کہ ''اللہ کے نام سے میں (فلاں کام) شروع کرتا ہوں''۔ اس طرح فعل کی نسبت متکلم کی طرف ہو جاتی ہے اور اسی کا فاعل ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔ یہاں مصلحت یہ تھی کہ انسان خود کو باری تعالیٰ کے لطف و کرم کا اس

حد تک محتاج سمجھے کہ تمام امور کی نسبت اسی ذات کاملہ کی طرف کر دے۔ ہر چند کہ افعال کا صدور انسان ہی سے ہوتا ہے۔ لیکن ہر فعل کے صادر کرنے کی قوت وہمت اور طاقت وصلاحیت انسان کو بارگہ رب ذوالجلال سے نصیب ہوتی ہے کیونکہ تمام قوتوں اور طاقتوں کا مبداء وسرچشمہ وہی ذات ہے۔ چونکہ تسمیہ میں بسم اللہ کے ذریعے خدا کی مدد اور اس کے فعلِ عنایت کا ذکر آ گیا تھا۔ اس کے بعد متکلم کا اپنا فاعل ہونا بیان کرنا اللہ تعالیٰ کی شانِ الوہیت کے منافی تھا۔ گویا یہ تعلیم دی گئی کہ اے انسان تو ہر کام شروع کرتے ہوئے خدا کا نام لے اور اس کام کی توفیق بھی اسی ذات کی طرف منسوب کر۔ کبھی بھی اس فعل کو اپنا کمال نہ سمجھ' کیونکر فاعل حقیقی تو نہیں اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ یہاں انسانی فکر کو کبر ونخوت کی تباہ کاریوں سے بچنے کی صورت بتائی گئی ہے کہ اگر انسان زبان سے ذاتِ حق کا نام لے کر دل میں یقین بھی اسی کی طاقت کی کارفرمائی پر رکھے گا تو سوچ کا یہ اندازا سے کبھی بھٹکنے نہ دے گا۔ یہ فکر ایمانی آداب کا لازمہ ہے سورۃ نساء میں اسی کی تلقین کی گئی ہے۔

قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِاللّٰهِ ط فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَايَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا۔
(النساء ۴:۷۸)

فرما دیجیئے سب کچھ اللہ کی طرف سے ہی ہے تو ان لوگوں کو کیا ہوا۔ کوئی بات سمجھتے معلوم نہیں ہوتے۔

یہاں ہر کام کی توفیق کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہونا مذکور ہے۔ اسی اندازِ سخن اور طرز فکر کی تلقین تسمیۃ کے ذریعے کی جا رہی ہے۔ یہاں ایک اور لطیف نکتہ قابلِ غور ہے کہ بسم اللہ میں چونکہ ذکر صرف اللہ تعالیٰ کا ہے اور ابتداء فعل یا ارتکابِ فعل کی نسبت انسان کی طرف مذکور نہیں ہے۔ اس لیے حکم ہے کہ بسم اللہ محض جائز کاموں کے آغاز میں پڑھی جائے۔ ناجائز اور خلاف شرع امور نہیں۔ کیونکہ غلط کاموں میں توفیق فعل کے حوالے سے ان کی نسبت باری تعالیٰ کی طرف کرنا خلاف تقاضائے بندگی ہے۔ بندے کو یہ زیب نہیں دیتا کہ اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کو اپنے آقا کی طرف منسوب کرتا پھرے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

مَآ اَصَابَکَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَا اَصَابَکَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِکَ۔
(النساء ۴:۷۹)

(اے انسان اپنی تربیت یوں کر کہ) جب تجھے کوئی بھلائی پہنچے تو (سمجھو کہ) وہ اللہ کی طرف سے ہے (اسے اپنے حسنِ تدبیر کی طرف منسوب نہ کر) اور جب تجھے کوئی برائی پہنچے تو (سمجھ کہ) وہ تیری اپنی طرف سے ہے (یعنی اسے اپنی خرابیٔ نفس کی طرف منسوب کر)۔

مذکورہ بالا دو آیات میں حقیقت حال بھی واضح کر دی گئی ہے اور آداب فکر وقول بھی کہ توفیق اور طاقت ہر کام کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے منسوب ہوتی ہے۔ لیکن نیکی صادر ہو تو بندگی یہ

ہے کہ انسان اسے اپنے آقا کی رحمت سمجھ کر اسی کی طرف منسوب کر دے اور بدی صادر ہو تو اسے اپنی سوچ اور کاوش کا نتیجہ سمجھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی اندازِ فکر سے انسان کی اپنے عیبوں اور کوتاہیوں پر نظر رہتی ہے اور وہ خود تنقیدی کے ذریعے اپنی اصلاح کا طالب و خوگر ہو سکتا ہے اور دوسری طرف وہ بعض اچھائیوں کو محض اپنی صلاحیت کا ثمرہ سمجھ کر پیکرِ رعونت بھی نہیں بننے پاتا۔ چونکہ ہر کام کی توفیق اور ہمت و قدرت کا مبداء و منبع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس لیے تسمیہ میں اسی کے مجرد ذکر پر اکتفا کیا گیا اور انسان کے فعل یا اس کے فاعل ہونے کا ذکر محذوف کر دیا گیا۔ گویا حقیقت کو عیاں رکھا اور جو کچھ محض ظاہر تھا اسے پوشیدہ کر دیا۔

آیت الحمد سے استدلال:

سورۃ الفاتحہ کا آغاز بھی اسی فلسفے کی نشاندہی کرتا ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ O (الفاتحہ ۱:۱)

سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کی پرورش فرمانے والا ہے O

یہ بات بڑی واضح ہے کہ جب کسی کی خوبی یا تعریف ہوگی تو یقیناً کوئی نہ کوئی تعریف کرنے والا بھی ہوگا۔ کیونکہ زبانِ حمد کھولے بغیر بیانِ حمد نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہاں حمد کا ذکر ہے حامد یا فعلِ حمد کا بیان نہیں ہے۔ محض اس لیے کہ اگر حمد کرنے والے کا ذکر کر دیا جاتا تو ممکن ہے وہ یہ سمجھتا کہ محمود میری حمد کا محتاج ہے یا میری تحمید نے اسے عظمت دی ہے۔ حالانکہ حمد کسی کا کارنامہ نہیں۔ یہ حسنِ الوہیت کا اپنا استحقاق ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اپنا محمود ہونا بیان کر دیا۔ مگر کسی کا حامد ہونا صراحت سے بیان نہیں کیا۔

اسی طرح تسمیہ میں فعل اور فاعل کو مضمر اور محذوف رکھنے میں حکمت یہ تھی کہ یقیناً وہ کام جس کے آغاز میں بسم اللہ پڑھی جا رہی ہے تو کوئی نہ کوئی شخص ہی کرے گا۔ لیکن کہیں وہ اپنی فاعلیت پر ایسا گمان نہ کرنے لگے کہ یہ کام میں اپنی ہمت و توفیق سے کر رہا ہوں۔ چنانچہ خدا کا نام محض برکت کی غرض سے نہیں بلکہ اس یقین و اعتماد سے لیا جائے کہ اس کام کی توفیق بھی محض اللہ تعالیٰ کی عطا سے ہے۔

چوتھی حکمت:

اولاً یا آخراً کسی صورت میں بھی خدا کے ماسوا کے ذکر کا تسمیہ میں نہ ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ واجب الوجود صرف اسی کی ذات ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ ممکن ہے اور اس وجہ سے ہالک و معدوم۔ تسمیہ چونکہ تمام معارف قرآنی کا خلاصہ ہے اس لیے اس کا اندازِ بیان بھی دینِ حق کے جملہ مقاصد و مطالب کا خلاصہ ہوگا۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا آغاز و انجام صرف خدا ہی کی ذات و صفات کے ذکر پر مبنی ہے اس کے علاوہ اس میں نہ کسی فعل کا بیان ہے نہ کسی فاعل کا۔

گویا یہ الفاظ خدا کی وحدانیت کو اسی طرح اجاگر کر رہے ہیں کہ اس کائنات میں اس کے بغیر نہ تو کسی فعل کا صدور ممکن ہے اور نہ کسی فاعل کا وجود۔ بلکہ دوامِ حقیقی اور ثباتِ ابدی اگر کسی کو حاصل ہے تو وہ صرف خلاّق عالم ہی کی ذات وصفات ہے۔ وہی اول تھا اور وہی آخر بھی ہوگا۔ اس لیے نہ اس سے پہلے کسی فعل کا ذکر ممکن ہے اور نہ اس کے بعد ارشاد ربانی ہے۔

۱۔ هُوَ الۡاَوَّلُ وَالۡاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالۡبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيۡءٍ عَلِيۡمٌO (الحدید ۵۷:۳)	وہ (سب سے) پہلا تھا اور (سب سے) آخر اور (اپنی قدرت کے اعتبار سے) ظاہر اور (اپنی ذات کے اعتبار سے) پوشیدہ ہے وہ سب کچھ خوب جانتا ہےO
۲۔ لِلّٰهِ الۡاَمۡرُ مِنۡ قَبۡلُ وَمِنۡۢ بَعۡدُ۔ (الروم ۳۰:۴)	حکم اللہ ہی کا ہے، پہلے بھی اور بعد میں بھی۔

اسی امر کا بیان ایک اور مقام پر اس طرح ہے۔

۳۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ كُلُّ شَيۡءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجۡهَهٗ۔ (القصص ۲۸:۸۸)	اس کے سوا کوئی معبود نہیں (لوگو! خوب یاد رکھو فانی شے معبود نہیں ہوا کرتی) ہر شے اللہ کی ذات کے سوا فانی ہے۔

چنانچہ تسمیہ کے کلمات میں خدا کے سوا ہر قسم کے فعل اور فاعل کے ذکر کا محذوف و معدوم ہونا انسان کو پوری کائنات اور اسکے نظام کی بے ثباتی کی یاد دلاتا ہے۔ یہ کلام پکار پکار کر دنیا کی بے حقیقت رنگینیوں میں محو و مستغرق انسانوں کو حقیقتِ ابدی کی طرف متوجہ کر رہا ہے تاکہ لوگ خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر بے کم و کاست اسی احکم الحاکمین کی قدرتوں اور قوتوں پر کامل ایمان لے آئیں اور اس سرابِ حیات کو ہی آخری منزل نہ سمجھ لیں۔

تسمیہ سے چونکہ قرآن کا آغاز ہو رہا ہے۔ اس موقع پر جامع و مانع انداز سے خدا کی ہستی اور اس کی صفات کا ذکر اور اس کے ماسوا کا حذف و اضمار انسان کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ وہ دل و دماغ سے غیر کا خیال نکال دے اور ہر لحہ ذاتِ حق پر نظر رکھے۔ یہ معراج عبدیت ہے اور قرآن کا پہلا سبق بھی یہی ہے جیسا کہ ارشاد ایزدی ہے۔

وَلِلّٰهِ الۡمَشۡرِقُ وَالۡمَغۡرِبُ فَاَيۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡهُ اللّٰهِ۔ (البقرہ ۲:۱۱۵)	اور مشرق و مغرب (سب) اللہ ہی کا ہے پس تم جدھر بھی رخ کرو ادھر ہی اللہ کی توجہ ہے۔

مزید برآں وہ ایسا موجود حقیقی ہے کہ ہر وجود کا مبداء بھی وہی ہے اور مرجع بھی۔ بلکہ دوسرے لفظوں میں ہر وجود کائنات کا جواز بھی اسی کے وجود سے ہے۔ وہ حقیقت ہے اور اس کے

ماسوا جو کچھ ہے مجاز ہے۔اس لیے تسمیہ میں حقیقت کا ذکر کیا گیا اور مجاز کو ترک کر دیا۔

حرفِ باء کی افادیت:

کلماتِ تسمیہ کا پہلا حرف ''بار'' ہے۔جس کا معنی ''سے'' کیا گیا ہے یہ فعل محذوف سے متعلق ہے۔محذوف سے مراد وہ فعل اور فاعل ہے۔جس کا ذکر یہاں لفظاً نہیں بلکہ معناً موجود ہے۔یعنی میں شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے گویا حرفِ باء فعلِ محذوف کو اللہ کے نام سے ملانے کے لیے استعمال ہوا ہے۔حرفِ باء کی اپنے استعمال و افادیت کے لحاظ سے متعدد اقسام ہیں۔ جنہیں علماء نحو نے شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔لیکن یہاں یہ حرف ان میں سے تین اقسام پر مشتمل ہوسکتا ہے۔

۱۔بائے الصاق ومصاحبت

۲۔بائے استعانت

۳۔بائے تیمن وتبرک

بائے مصاحبت:

الصاق ومصاحبت کا معنی اکٹھا ہونا اور رفاقت ومعیت اختیار کرنا ہے۔

اس صورت میں جب کہ با مصاحبت کے لیے تصور کی جائے تو تسمیہ کا مفہوم یہ ہوگا کہ میں اللہ کے نام کو اپنا ساتھی بناتے ہوئے اس کے دامن رحمت سے وابستہ اور منسلک ہوتے ہوئے اور محض اسی کی رفاقت ومعیت پر بھروسہ کرتے ہوئے' اپنے کام کا آغاز کرتا ہوں۔امام فخر الدین رازیؒ اس مقام پر فرماتے ہیں۔

هذا الباء باء الا لصاق فهو يلصق العبد بالرب فهو كمال المقصود۔

یہ ''با'' بائے الصاق ہے چنانچہ یہ بندے کو رب سے ملاتی ہے اور یہی انسانی مقصود کا کمال ہے۔

(تفسیر کبیر'۱:۹۹)

حرف باء کے اس مفہوم کی افادیت یہ ہے کہ تسمیہ کے ذریعے انسان کو اپنے ہر کام کے آغاز سے انجام تک خدا کی رفاقت ومعیت کا احساس رہے۔یہ امر واقع ہے کہ اگر انسان کو کسی نہایت قوی' مضبوط اور ہمدرد بہی خواہ ساتھی کی رفاقت کا احساس اور یقین ہوتو اسے کسی سطح پر بھی خوف وخطر دامنگیر نہیں ہوسکتا۔چنانچہ انسان کو کارگہ زیست میں ہر خوف وغم سے بے نیاز کرنے کے لیے بسم اللہ کے ذریعے دل ودماغ میں یہ احساس جاگزیں کیا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کروگے تو اس کی معیت بھی تمہیں حاصل ہوگی۔جس کی حفاظت کے باعث تمہیں نہ کوئی نقصان پہنچ سکے گا اور نہ تمہاری کاوشیں بے نتیجہ حاصل ہوں گی۔اسی تصور کو قرآن یوں بیان کرتا ہے۔

وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌO	وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہےO
(الحدید' ۵۷:۴)	

اسی شب ہجرت حضرت صدیق اکبرؓ کو غار ثور میں تنہائی کے احساس سے کچھ خدشہ محسوس ہوا کہ شاید کفار مکہ جو آنحضورﷺ کے تعاقب میں تھے۔ انہیں نقصان پہنچا دیں۔ اس پر حضور نبی اکرمﷺ نے ان سے بزبان وحی ان سے ارشاد فرمایا:

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا فَاَنْزَلَ اللّٰہُ سَکِیْنَتَہٗ عَلَیْہِ۔	غمزدہ نہ ہو بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے پس اللہ نے ان پر اپنی تسکین نازل فرمادی۔
(التوبہ' ۹:۴۰)	

اس ارشاد پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ خدا کی معیت پر ایمان تو حضرت صدیق اکبرؓ کا پہلے سے ہی تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اس قدر عداوت ومخالفت کے ماحول میں اپنے گھر والوں کو اکیلا چھوڑ کر حضورﷺ کے شریکِ سفر نہ ہوتے۔ لیکن ظاہرًا بے سروسامانی کا عالم' تنہائی کا ماحول اور کفار ومشرکین کے مخاصمانہ تعاقب کا خیال وقتی طور پر حزن وملال کا باعث بن گیا اور یہ انسانی طبیعت کا لازمی تقاضا بھی تھا۔ اس پر آنحضورﷺ نے صرف انہیں معیت خداوندی کی طرف متوجہ کردیا۔ یہ احساس بحال ہونا تھا کہ دل کو سکون واطمینان کی دولت نصیب ہوگئی۔ گویا معیت خداوندی قلبی تسکین کا لازمی سبب ہے۔ یہی فلسفہ تسمیہ ہے کہ انسان خدا کی معیت کو رفاقت کا احساس اجاگر کرکے جہدِ حیات کا آغاز کرے تو کوئی خوف وحزن سے اسے پریشان نہیں کرسکتا۔ خوف وحزن سے نجات پاکر انسانی جدوجہد کو وہ تازگی اور قوت میسر آتی ہے۔ جس سے کامیابی وکامرانی کی منزل بھی آسان ہوجاتی ہے۔ ورنہ بے یقینی اور مایوسی کی کیفیت تگ و دو کو مطلوبہ منزل تک نہیں پہنچنے دیتی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فَلَا تَھِنُوْا وَتَدْعُوْآ اِلَی السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰہُ مَعَکُمْ وَلَنْ یَّتِرَکُمْ اَعْمَالَکُمْO	پس تم سستی نہ کرو اور خود صلح کی طرف نہ بلاؤ اور تم ہی غالب آؤ گے اور اللہ تمہارے ساتھ ہے اور وہ ہرگز تمہاری کوششیں بے نتیجہ نہیں جانے دے گا۔
(محمد' ۴۷:۳۵)	

یہاں یہ امر ذہن نشین رہے کہ خدا کی معیت تو درحقیقت ہمہ وقت انسان کو حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اسے اس معیت کا احساس اور شعور نہیں ہوتا۔ شعورِ معیتِ الٰہی متحقق نہ ہونے کی بناء پر وہ اس کے جملہ ثمرات ولطائف سے بہرور نہیں ہوسکتا۔ تسمیہ معیتِ الٰہی مہیا کرنے کے لیے نہیں بلکہ اس کا شعور بیدار کرنے کے لیے ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِO (ق٥٠:١٦)	اور بے شک ہم نے آدمی کو پیدا کیا اور ہم جانتے ہیں جو وسوسہ اس کا نفس ڈالتا ہے اور ہم اس سے اس کے دل کی رگ سے بھی زیادہ نزدیک ہیںO

اس آیت سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہوگئی کہ معیت الٰہی تو انسان کو پہلے سے ہی میسر ہوتی ہے۔ لیکن اس کا شعور پیدا نہیں ہوتا۔ جب اس معیت و رفاقتِ خداوندی کا شعور انسان کے اندر ایک زندہ قوت بن جاتا ہے تو تمام وساوس نفسانی اور دنیوی خطرات وخدشات نیست ونابود ہوجاتے ہیں اور قلب و باطن پر اس احساس کے محیط ہوجانے سے ایک عجیب لطف وسکون اور لذت وطمانیت کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ انسان کو پھر نہ تو کسی اور کی رفاقت کی طلب رہتی ہے اور نہ کسی کے قرب کی۔

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذت آشنائی

لیکن اس لطف کا اندازہ بیان سے نہیں خود دھیان سے ہی ہوسکتا ہے کیونکہ لذت بتانے کی نہیں حاصل کرنے کی چیز ہے۔

بائے استعانت:

استعانت سے مراد مدد طلب کرنا ہے اس کے معنی کے لحاظ سے مفہوم تسمیہ یہ ہوگا کہ ''اللہ کے نام سے مدد طلب کرتے ہوئے شروع کرتا ہوں''۔ حضرت نوح علیہ السلام نے قیامت خیز طوفان سے اپنے پیروکاروں کو بچانے کے لیے حکم الٰہی سے ایک کشتی بنائی اور انہیں اس میں سوار ہوجانے کو کہا۔ قرآن حکیم اس کا تذکرہ اس طرح کرتا ہے۔

وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌO (ھود١١:٤١)	اور نوح نے کہا تم لوگ اس میں سوار ہو جاؤ اللہ ہی کے نام سے چلنا اور اس کا ٹھہرنا ہے بے شک میرا رب بڑا ہی بخشنے والا نہایت مہربان ہےO

گویا اس آیت کے ذریعے جملہ مہمات میں خدائے رحمان و رحیم کے نام سے استعانت کی تعلیم دی جارہی ہے تاکہ انسان پر یہ حقیقت آشکار ہو کہ اللہ تعالیٰ کی مدد واعانت کے بغیر نہ تو کسی خیر کو حاصل کیا جاسکتا ہے اور نہ کسی شر سے محفوظ ہوا جاسکتا ہے۔ چونکہ فعل محذوف کے اعتبار سے یہاں کام کے شروع کرنے کا ذکر ہورہا ہے۔ اس لیے بائے استعانت کا معنوی اطلاق یوں ہوگا کہ ''اے اللہ میں ہر کام کے شروع کرنے میں بھی تیری مدد کا محتاج ہوں''۔ جب

کوئی کام خدا کی مدد اور توفیق کے بغیر آغاز پذیر ہی نہیں ہوسکتا تو اس کا انجام پذیر ہونا کیونکر ممکن ہوگا۔ دراصل یہاں انسان کو اپنی حاجتمندی کا احساس دلایا جارہا ہے تاکہ وہ دینوی متاع کو کثرت کے ساتھ حاصل کر کے خدائے لم یزل کے حضور سر نیازِ خم کرنے سے باغی نہ ہوجائے۔ انسان کے ذہن میں یہ حقیقت ہر وقت موجود رہے کہ میں رب ذوالجلال کی عنایت کے بغیر اپنی جہدِ حیات میں پہلا قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ کس قدر ظالم اور احسان فراموش ہے وہ شخص جس کا قدم بھی خدا کے لطف وانعام سے اٹھے۔ لیکن وہ بجائے اس کی اطاعت کے اسی کے احکام کی خلاف ورزی کے لیے بڑھ رہا ہو۔ اگر انسان کا یہ شعور بیدار ہو کہ اس کی زبان کو قوتِ گویائی' اس کے کانوں کو قوتِ سماعت' اس کی آنکھوں کو قوتِ دید' اس کے دست و بازو کو قوتِ عمل' اس کے قدموں کو قوتِ نقل و حرکت اور اس کے دماغ کو قوتِ فکر الغرض سب کچھ خدا کی مدد و اعانت کے سبب میسر آیا ہے تو اس ظاہری اور باطنی اعضاء و جوارح میں سے کوئی عضو بھی رضائے الٰہی کے خلاف حرکت میں نہ آئے۔ ہم سے جو گناہ سرزد ہوتے ہیں اور ہمارے فکر میں جو تمرد وانحراف جنم لیتا ہے یہ دراصل اسی شعور وادراک کے فقدان کا نتیجہ ہے۔ تسمیہ فی الحقیقت انسان کی فکری و عملی اصلاح کا شاندار ذریعہ ہے۔ اگر ہر کام شروع کرنے سے پہلے زبان اور دل خدا کا نام لینے اور اس سے مدد طلب کرنے کی طرف راغب ہوں اور یہ انکی عادی خصوصیت بن جائے تو نواہی و محرمات سے از خود پرہیز ہونے لگے گا۔ کیونکہ خدا کی یاد کے ہوتے ہوئے حکمِ خدا کی خلاف ورزی ممکن نہیں رہتی۔

مزید برآں استعانت دعا ہے اور دعا خود مغزِ عبادت۔ اس لحاظ سے تسمیہ فی نفسہ عبادت کی روح قرار پاتا ہے۔ اس کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان خود کسی کام کے کر سکنے میں اپنے ذرائع اور اسباب و وسائل کے باوجود نا کافی و عاجز تصور کرتا ہے اور پھر اپنی بے بسی و بے کسی کے اعتراف کے ساتھ خدا بزرگ و برتر کی مناجات کرتے ہوئے اس سے مدد طلب کرتا ہے۔ گویا انسان بارگاہ ایزدی میں سراپا سوال بن کر حاضر ہے' وہ دنیا و مافیہا سے ناامید اور تمام اسباب سے مایوس ہوکر مسبب الاسباب کی بارگاہ میں نیازمندی کے ساتھ آن کھڑا ہوا ہے۔ اس کی آرزومندی دل کو درد و سوز کی لذت سے آشنا کر دیتی ہے اور یہی کیفیت انسان کو مقامِ بندگی سے ہمکنار کرتی ہے۔ بقول شخصے

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کردیا مجھ کو
وگرنہ میں خدا ہوتا جو دل بے مدعا ہوتا

اسی مقام کو علامہ اقبال یوں بیان کرتے ہیں۔

متاعِ بے بہا ہے درد و سوز و آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

قرآن میں حرفِ باء کا استعمال کئی مقامات پر اسی مقصد کے لیے ہوا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ط اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِيْنَO	اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعے (مجھ سے) مدد چاہا کرو یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کیساتھ ہوتا ہےo

(البقرہ، ۲:۱۵۳)

یہاں صبر اور نماز دونوں کو ذریعہِ استعانت کے طور پر بیان کیا گیا ہے کہ استعانت تولامحالہ باری تعالیٰ سے ہوگی لیکن اس کے کامل استحقاق کے لیے صبر و نماز کو اپنا لوتا کہ ان کے واسطے سے اللہ تعالیٰ کا لطف وکرم اور عنایت و اعانت زیادہ سے زیادہ نصیب ہو سکے۔ اسی تصور کو ایک اور مقام پر یوں واضح کیا گیا ہے۔

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا۔	موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا! تم اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو۔

(الاعراف، ۷:۱۲۸)

اسباب سے صرفِ نظر کر کے مسبّب الاسباب پر نظر رکھنا ہی صبر کہلاتا ہے۔ اس لیے قرآن استعانت کے ساتھ توحید مطلب کی بھی تعلیم دے رہا ہے۔ تسمیہ میں بائے استعانت سے پہلے یا بعد میں کسی کا ذکر نہیں۔ صرف خدا ہی کے نام پر اکتفا کیا گیا ہے۔ جس کا واضح مقصد یہی ہے کہ انسان کی تمام ضروریات و مشکلات میں خدا ہی کی ذات کافی ہے۔ اسے کسی اور چیز پر توکل یا انحصار کی ضرورت نہیں۔

بائے تبرک:

تبرک کا معنی حاصل کرنا ہے۔ لہذا بائے تبرک کے حوالے سے تسمیہ کا معنی یہ ہوگا کہ ”اللہ کے نام سے برکت حاصل کرتے ہوئے شروع کرتا ہوں“۔ خدا کے نام سے شروع کرنا اس اعتبار سے باعث برکت ہے کہ اس کام کے پایہ تکمیل تک پہنچنے کے امکانات زیادہ روشن ہو جاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اسباب و وسائل کا مہیا کرنا بھی تو اسی کا کام ہے۔ اس لیے جب اس ذات کے مقدس نام سے برکت طلب کی جائے تو وہ ذات اس کام کا انجام تک پہنچنا آسان کر دیتی ہے۔ اس لیے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

كل امر ذى بال لا يبدا فيه ببسم الله فهو أجذم او أقطع اولم يبدا فيه باسم الله فهو أبتر اولا يفتح بذكر الله فهو أبتر أو أ قطعا۔

۱۔سنن ابن ماجہ،۱:۶۱۰،رقم:۱۸۹۴
۲۔کنز العمال،۱:۵۵۵،رقم:۲۴۹

جو کام بسم اللہ پڑھے بغیر شروع کیا جائے وہ دم بریدہ اور ناقص رہ جاتا ہے، جو کام بسم اللہ کے شروع کے بغیر شروع کیا جائے ناتمام رہ جاتا ہے، جس امر کا افتتاح خدا کے ذکر کے بغیر ہوگا وہ انجام خیر تک نہیں پہنچے گا۔

اس وقت ہمارے پیش نظر لفظ اسم کی لغوی اور معنوی دلالت نہیں ہے۔ سردست ہم نحوی قاعدے کے مطابق اس کے صرف ایک پہلو پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ عربی زبان میں کلمہ تین قسم کا ہوتا ہے۔

حرف، فعل اور اسم

تمام ائمہ نحو وادب اس امر پر متفق ہیں کہ:

الحرف هى الكلمة لا يصح الاخبار عنها ولا بها۔

حرف وہ کلمہ ہے جو نہ تو کسی اور کی خبر دیتا ہے اور نہ خود کسی پر دلالت کرتا ہے۔

حرف جب تک کسی اور سے منسلک نہ ہو اس میں کوئی معنویت پیدا نہیں ہوتی۔ یعنی یہ ازخود کسی کامل مفہوم کی نشاندہی نہیں کرسکتا۔ اس لحاظ سے نہ ''مسند'' ہے اور نہ ''مسند الیہ''۔

الفعل هى الكلمة لا يصح الاخبار عنها لكن يصح الاخبار بها۔

فعل وہ کلمہ ہے جو فی نفسہ کسی اور کی خبر تو نہیں دے سکتا لیکن خود کسی نہ کسی خبر پر دلالت کرتا ہے۔

اس لحاظ سے فعل ''مسند الیہ'' نہیں۔ یعنی اس کو خود تو کسی عمل یا خبر سے نسبت ہوتی ہے مگر کسی اور کو اس سے بالذات کوئی نسبت نہیں ہوتی۔ جب تک کوئی اسم اس کا فاعل بن کر مذکور نہ ہو۔ اس کی معنویت بھی کامل نہیں ہوسکتی۔

الاسم هى الكلمة يصح الاخبار عنها وبها۔

اسم وہ کلمہ ہے جو خود بھی کسی اور کی خبر دیتا ہے اور کوئی بھی اس سے نسبت رکھتا ہے۔

اس لحاظ سے اسم کو ''مسند'' اور ''مسند الیہ'' دونوں حیثیتیں حاصل ہوتی ہیں۔ یعنی یہ خود بھی اپنی ذات میں کسی نہ کسی کی خبر دیتا ہے اور کوئی دوسرا اس سے منسلک ہو جائے یا اس سے نسبت پیدا کر لے تو وہ بھی بامعنی یعنی کامل بن جاتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر اسم خود ''کامل گر'' بھی ہے۔ مذکورہ بالا تینوں کلمات کا باہمی تعلق یہ ہے کہ حرف بھی اس سے نسبت پیدا کر کے خود کو بامعنی بناتا ہے،

فعل بھی اسم سے نسبت پیدا کر کے اپنی معنویت اور دلالت کو کامل بناتا ہے۔ لیکن اسم ایک ایسا کلمہ ہے جو خود ہی اپنے مقصد اور ذات معینہ پر دلالت کرتا ہے یا اس کی خبر دیتا ہے۔ اس کو اپنی اس حیثیت کی تشکیل کے لیے نہ کسی اور حرف کی حاجت ہے نہ کسی فعل کی۔ گویا اسم میں دلالتِ کاملہ اور دلالتِ مطلقہ ہوتی ہے۔ فعل میں ناقصہ اور حرف میں سرے سے ہوتی ہی نہیں۔

تسمیہ میں فعل، حرف اور اسم کے باہمی تعلق پر اشارۂ لطیف:

مذکورہ بالا بحث کی روشنی میں ''تسمیہ'' کے الفاظ پر غور فرمائیں تو ''فعل''، جس کا تعلق کسی غیر سے ہوسکتا تھا، مخدوف کر دیا گیا۔ کلماتِ تسمیہ کا آغاز ''حرف باء'' سے کیا گیا۔ جو اپنی ذات میں کوئی معنی و مفہوم نہیں رکھتا۔ اس میں جو بھی معنویت اور افادیت پیدا ہوئی ہے۔ صرف اسم کے ساتھ نسبت پیدا کرنے کے باعث ہوئی ہے۔ ''حرف باء'' کا مقصد محض اپنے ماقبل مخدوف کو یعنی کسی غیر کو جو متکلم یا فعل ہوگا، اسم کے ساتھ ملانا ہے۔ پھر لفظ ''اسم'' وارد کیا گیا اور اس کے بعد ''اللہ الرحمٰن الرحیم'' کے الفاظ بیان ہوئے۔ اسم کا معنی ''علامت'' ہے۔ ذات وصفات باری تعالٰی کے ذکر سے پہلے ''اسم'' کا لایا جانا اس بات کو واضح کرنا تھا کہ اللہ اپنی واحدانیت، الوہیت اور ہویت میں اس طرح غیر محسوس و غیر مبصر، وہم وادراک سے بالا اور عقل وخرد سے بلند ہے کہ اس تک کسی کا وہم وگمان نہیں پہنچ سکتا، بندوں کا اس تک وصول محال ہے۔ لہٰذا اس مخفی و باطن اور پاک ومنزہ ہستی تک وصول کے لیے ایسی علامت درکار ہے جو خود ظاہر ہو، اس ہستی کی خبر دینے والی ہو، اپنی ذات کے ظہور میں بھی کامل ہو اور اس ذات مطلق کے اظہار کے لیے بھی کامل ہو، جو خود اس کی خبر بھی رکھتی ہو اور دوسروں کو اس سے باخبر بھی کرسکتی ہو یعنی وہ علامت ذات حق کے ظہور کی ایسی دلیل بن جائے کہ خود بھی اس سے ملی ہوئی ہو اور دوسروں کو بھی اس سے ملا سکے اور اس غرض سے دوسرے اس علامت سے نسبت و تعلق قائم کرنے کے لیے مجبور و مامور ہوں۔ ایسی علامت کاملہ جس کی شان یہ ہو کہ۔

اُدھر سے اللہ سے واصل، اِدھر مخلوق میں شامل
خواص اس برزخ کبریٰ کو ہے حرفِ مشدد کا

وہ علامت صرف ذات محمدی ﷺ کی ہی تھی جسے ''کلمہ اسم'' کے عنوان سے بطور ذریعہ بیان کر دیا گیا۔

تصورِ دلالت اور کلمۂ اسم کی وساطت:

یہاں یہ امر غور طلب ہے کہ لفظ ''اللہ'' کی دلالت کے لیے کلمۂ اسم بطور ذریعہ وارد ہوا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ''کیا ذات حق اپنی دلالت کے لیے کسی ذریعے کی محتاج ہے؟'' اس کا جواب صاف نفی میں ہے۔ بذاتِ خود باری تعالٰی اپنی دلالت کے لیے کسی ذریعے، واسطے اور

علامت کی محتاج نہیں ہے لیکن اس حقیقت سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کلمہ اسم اللہ ذات باری تعالیٰ ہی کی دلالت کے لیے بطور ذریعہ و علامت وارد ہوا ہے تو پھر اس ذریعے اور علامت کی احتیاج کس کو ہے۔

اس کا جواب خود عبارت تسمیہ میں ہے جو حرف باء سے شروع ہوتی ہے۔ ''حرف باء'' اپنے سے پہلے بہر صورت کسی فعل و فاعل کو محذوف کے طور پر طلب کرتا ہے۔ یہ محذوف وہ شخص ہے جو بارگہ الوہیت تک رسائی حاصل کرنا چاہتا ہے جو ''اَبداء' اَشرع' اَقراء وغیرہ'' کا فاعل ہے اور اس شخص کو ''اسم'' یعنی علامت ذات حق سے ملانے کے لیے حرف باء درمیان میں لگایا گیا ہے۔ گویا مخلوقِ خدا حرف باء کے توسل سے اسم کے ساتھ اپنی نسبت پیدا کر رہی ہے تاکہ اسم کے ساتھ نسبت اور تعلق پیدا کر کے طالبان حق کو ذات حق تک رسائی نصیب ہو سکے۔

یہ اسم علامت کے طور پر اس ہستی مبارکہ کو بیان کر رہا ہے جو ذات حق سے واصل اور اس کی عارف بھی ہے اور دیگر مخلوقات کو ذات حق کا وصال اور معرفت عطا کرنے والی بھی۔

ذاتِ محمدی ﷺ کلمہ اسم کا مدلول کامل ہے:

پورا قرآن شروع سے آخر تک اس امر کی تائید کرتا ہے کہ اسی مقصد کے لیے دنیا میں انبیاء و رسل تشریف لاتے رہے۔ وہ ذات حق کی معرفت اور اس تک رسائی کا بہترین ذریعہ و واسطہ بھی تھے اور علامت و دلالت بھی۔ پھر یہ انبیاء و رسل ایک دوسرے پر فضیلت بھی رکھتے تھے۔ ارشاد قرآنی ہے۔

تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ۔ (البقرۃ،۲:۲۵۳)	یہ سب رسول (جو ہم نے مبعوث فرمائے) ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

انبیاء و رسل کی تمام فضیلتیں جس نقطے پر جا کر اپنے منتہائے کمال کو پہنچ گئیں۔ وہ نقطہ نبوت محمدی ﷺ کا تھا۔ اس لیے ذات حق پر آپ کی دلالت بھی سب سے زیادہ اکمل و افضل تھی اور آپ کی شانِ علامت بھی سب سے ارفع و اعلیٰ تھی۔ اس لیے نبوت و رسالت جہاں مقام و مرتبہ کے اعتبار سے آپ کی ذات ستودہ صفات پر ختم ہوگئی۔ وہاں ادوار زمانی کے اعتبار سے بھی آپ ہی پر اختتام پذیر ہوگئی۔ چنانچہ ذات حق کی علامتِ تامہ اور دلالتِ مطلقہ ذات مصطفوی ﷺ قرار پا گئی۔ قرآن مجید نے کئی مقامات پر اس حقیقت کی واضح نشاندہی بھی کی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ تَعَالُوْا اِلٰی مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَاِلَی الرَّسُوْلِ رَاَیْتَ الْمُنَافِقِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْکَ صُدُوْدًاO

(النساء، ۴:۶۱)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے نازل کردہ (قرآن) کی طرف اور رسول کی طرف آجاؤ تو آپ منافقوں کو دیکھیں گے کہ وہ آپ (کی طرف رجوع کرنے) سے گریزاں رہتے ہیںO

اس آیت نے صراحت کے ساتھ اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ منافقت یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے واسطہ کے بغیر ہی ذات حق کی بارگاہ میں باز یابی کے حصول کی کوشش کی جائے۔ یعنی منافقت کی پہچان یہ ہے کہ ''رسول کو وصالِ حق کا ذریعہ نہ مانا جائے۔ اس کو معرفت حق کی علامت اور ذاتِ حق کی دلالت تسلیم نہ کیا جائے''۔ یعنی منافق یہ سمجھتا ہے کہ نسبت رسول ﷺ کے بغیر ہی احکام خداوندی پر عمل باعثِ ایمان ثابت ہو جائے گا۔ حالانکہ قرآن اسے ''منافقت'' کہہ کر رد کر چکا ہے۔ اسی تصور کو ایک اور مقام پر یوں بیان کیا گیا ہے۔

وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ تَعَالَوْا یَسْتَغْفِرْلَکُمْ رَسُوْلُ اللّٰہِ لَوَّوْا رُءُ وْسَھُمْ وَ رَاَیْتَھُمْ یَصُدُّوْنَ وَھُمْ مُّسْتَکْبِرُوْنَO

(المنافقون، ۶۳:۵)

اور (ان کی حالت تو یہ ہے کہ) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ رسول اللہ تمہارے لئے (اللہ سے) بخشش طلب فرمائیں تو (یہ گستاخی سے) سر ہلاتے ہیں اور آپ دیکھتے ہیں کہ وہ بے رخی کرتے ہیں اور وہ تکبر کرتے ہیںO

ان گستاخانِ رسالت اور بے نیازانِ درِ نبوت کے بارے میں مزید حکم صادر کیا گیا۔'' کہ اے رسول اللہ ﷺ میری غیرت اور شان مجیت کا تقاضا یہی ہے کہ اگر یہ تیرے ذریعہ و واسطہ کو اپنا کر میری ذات تک پہنچیں گے تو انہیں بخش دوں گا۔ لیکن اس طرح تجھ سے منہ موڑ کر تجھ سے تکبر کرتے ہوئے، تجھے میری ذات تک رسائی کا واحد ذریعہ و واسطہ اور علامت نہ سمجھتے ہوئے براہ راست مجھ سے معافی مانگنا چاہیں یا تو سراپا رحمت و رافت ہونے کی بناء پر انکے غرور و تکبر کے باوجود اپنے طور پر ان کیلئے مغفرت مانگے تو میں ان بدبختوں کو پھر معاف نہیں کروں گا۔ ان کو تجھ سے منہ موڑنے کا مزہ چکھا کر ہی رہوں گا۔

سَوَآءٌ عَلَیْھِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَھُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْلَھُمْ لَنْ یَّغْفِرَ اللّٰہُ لَھُمْ ۔

(المنافقون، ۶۳:۶)

آپ ان کے لئے بخشش مانگیں یا ان کے لئے بخشش نہ مانگیں ان کے حق میں برابر ہے اللہ ان کو ہرگز نہ بخشے گا۔

اگر یہ آپ کی سفارش، شفاعت اور غلامی کے ذریعہ کو ٹھکرا کر بھی بخشے جائیں تو پھر ان غلامانِ رسالت کا کیا حال ہوگا جو قدم قدم پر تیری بارگاہ میں نیاز مندیاں کرتے ہیں اور تجھے میری ذات کی علامت سمجھ کر تیرے واسطے سے مجھ تک پہنچتے ہیں۔ میں ان بدنصیبوں کو ان خوش نصیبوں کے برابر نہیں ٹھہرا سکتا اور پھر میرا دستور مغفرت ہی یہی ہے کہ لوگ بارگاہ رسالت کی وساطت سے مجھ تک پہنچیں۔

باری تعالیٰ خود اعلان فرماتے ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ط وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَلَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًاO

(النساء، ۴:۶۴)

اور ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر اس لئے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے اور (اے حبیب) اگر وہ لوگ اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھے تھے آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے اور اللہ سے معافی مانگتے اور رسول ﷺ بھی ان کے لئے مغفرت طلب کرتے تو وہ (اس وسیلہ اور شفاعت کی بنا پر) ضرور اللہ کو توبہ قبول فرمانے والا نہایت مہربان پاتےO

اس آیت کا مفہوم و مدعا سابقہ آیت کی روشنی میں سمجھا جائے تو حقیقت منکشف ہوجاتی ہے کہ لوگ ظلم و معصیت کے بعد اگر ذات محمدی ﷺ کو واسطہ وصال الٰہی اور ذریعہ مغفرت حق مان کر در رسول ﷺ پر سر نیاز خم کر دیں، حضور اکرم ﷺ کی وساطت سے بارگاہ الوہیت تک رسائی کی آرزو کریں اور حضور ﷺ کو ذریعہ و واسطہ سمجھنے سے انکاری ہوں بلکہ آپ کی سفارش سے ہی منہ پھیر لیں تو پھر کوئی صورت نہیں کہ وہ بخشے جائیں۔ اس لیے کہ اندریں صورت میں ان کی بخشش سنت الٰہی کے خلاف ہے اور ارشاد ایزدی ہے۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًاO

(الفتح، ۴۸:۲۳)

اور آپ اللہ کی سنت میں کبھی فرق نہ پائیں گےO

متذکرہ بالا آیات نے اس حقیقت کو اظہر من الشمس کر دیا کہ ذات حق تک رسائی کے لیے صرف اور صرف ذات محمدی ﷺ ہی واسطہ و ذریعہ ہے۔ اسی وجہ سے آپ کو تسمیہ میں ''کلمہ اسم'' سے تعبیر کر دیا گیا اور آپ کو علی الاطلاق برھان من ربکم (تمہارے رب کی طرف سے حتمی و قطعی دلالت) کے لقب سے سرفراز کیا گیا ہے۔ چنانچہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی اولین تعلیم ہی یہی تھی کہ ذات باری تعالیٰ اور اس کی صفاتِ کاملہ تک رسائی واسطہ و علامت کے بغیر ممکن نہیں اور وہ

واسطہ جلیل ذات محمد مصطفیٰ ﷺ ہے جسے اس ذات نے محمد، احمد، حامد اور محمود کے اسماء مبارکہ کے ذریعے اپنی شان اسمیت سے نواز رکھا ہے۔

ذات محمدی ﷺ اور شان اسمیت:

مذکورہ بالا تحقیق کا خلاصہ یہ ہوا کہ جناب مصطفیٰ ﷺ ''اسم'' ہیں کیونکہ ان کو اللہ سے نسبت ہے اور ساری مخلوق خدا کو ان سے نسبت ہے یہی اسم کی شان اور تعریف پہلے بیان ہو چکی ہے کہ وہ مسند بھی ہوتا ہے اور مسندالیہ بھی۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنی اسی حیثیت کو اسطرح واضح فرمایا:

إنما أنا قاسم واللہ يعطي۔
(صحیح المسلم، ۲: ۳۳۳، ۱۲۔ کتاب الزکوۃ، ۳۳۔ باب النہی عن المسألۃ، رقم حدیث: ۱۰۰)

بے شک نعمتوں کو مخلوق خدا میں تقسیم میں ہی کرنے والا ہوں اور مجھے عطا اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔

اس حدیث صحیح کے ذریعے ذات محمدی ﷺ کی دو نسبتیں واضح ہو گئیں۔

۱۔ نسبت الی الخالق۔ ۲۔ نسبت الی الخلق

''نسبت الی الخالق'' یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ خالق سے حاصل کرتے ہیں اور ''نسبت الی الخلق'' یہ ہے کہ مخلوق میں تقسیم فرماتے ہیں۔

سورہ الضحیٰ میں یہی دو نسبتیں خاص انداز سے بیان کی گئی ہیں۔

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى O اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى O وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى O وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى O
(الضحیٰ، ۹۳: ۵۔۴)

اور بے شک قریب ہے کہ آپ کا رب آپ کو اتنا دے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے کیا اللہ نے آپ کو حالت یتیمی میں نہ پایا۔ پس اس نے آپ کو بلند مقام سے سرفراز کر دیا اور اس نے آپ کو اپنی محبت میں خود رفتہ پایا۔ پس اپنا قرب و وصال عطا کر دیا اور اس نے آپ کو اپنی نعمتوں کا ضرورت مند اور طلبگار پایا تو اتنا عطا کیا کہ غنی اور مالدار کر دیا۔

ان آیات میں پہلی نسبت کا بیان تھا کہ جس جس چیز کی ضرورت ذات مصطفوی ﷺ کو محسوس ہوئی رب ذوالجلال نے حضور اکرم ﷺ کو عطا کر دی۔ اپنی نعمتوں اور عطاؤں کے خزانے نے ذات نبوی پر اس طرح کھول دیئے کہ انہیں ''غنی'' یعنی بے نیاز کر دیا۔ اب مخلوق خدا کو

حکم دیا کہ میری نعمتوں اور عطاؤں کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو تمہارے لیے واسطہ اتم مقرر فرما دیا ہے۔ جاؤ درِ رسول اللہ ﷺ پر حاضری دو، وہاں دامن سوال دراز کرو، جو کچھ مانگو وہی کچھ ملے گا۔ کیونکہ ہم نے عطا میں کوئی کمی نہیں کی، وہ تقسیم میں بھی کچھ نہیں کریں گے۔ ساتھ ہی ''نسبت الی الخلق'' کے حوالے سے اپنے اسم مقدس کو حکم صادر فرمایا:

فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ O وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ O وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ O
(الضحیٰ، ۹۳:۹-۱۱)

پس اے محبوب، اے تقسیم کرنے والے اب اگر آپ کے پاس کوئی یتیم آئے تو اس (کے مانگنے) پر ناراض نہ ہوں، اور جو کوئی سائل آپ کے در پر آئے۔ پس اسے خالی نہ موڑیے اور اپنے رب کی عطاؤں اور نعمتوں کو ہر ایک میں تقسیم کر کے خوب چرچا کرو۔

لہٰذا ذات محمدی ﷺ کی شانِ اسمیت یہ قرار پائی کہ ''نسبت الی الخالق'' کے نتیجے میں ساری کائنات میں انعامات الٰہیہ کی تقسیم کے فیضان رحمت کے مظہر اتم بن گئے اور ''نسبت الی الخلق'' کے نتیجے میں ساری کائنات میں انعامات الٰہیہ کی تقسیم کے ضامن بن گئے بقول مولانا احمد رضا خان:

بخدا، خدا کا یہی ہے در، نہیں اور کوئی مفر مقر
جو وہاں سے ہو یہاں آکے ہو، جو یہاں نہیں تو وہاں نہیں

سورۃ الضحیٰ کی آیت متذکرہ ۸ اور ۱۰ اور حدیث مذکورہ بالا دونوں مقامات میں نہ ''عطا'' میں تخصیص فرمائی گئی ہے اور نہ تقسیم میں۔ عطا بھی مطلق اور بلا قید ہے۔ تقسیم بھی مطلق اور بلا قید ہے۔ اسی طرح سائلان و وابستگان پر بھی کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی کہ تم کیا مانگو اور کیا نہ مانگو۔ جو کچھ بھی مانگو گے، دنیا مانگو یا آخرت، سب کچھ ملے گا کیونکہ ہم نے اپنے محبوب کو بلا استثنیٰ تمہاری ضرورتوں سے بھی زیادہ عطا کر دیا ہے۔ پھر اس سے قبل یہ بھی اعلان فرما دیا گیا۔

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰی O
(الضحیٰ، ۹۳:۴)

اے محبوب! تمہاری ہر آنے والی گھڑی، گزری ہوئی گھڑی سے بہتر ہوگی۔

یعنی آپ پر ہر آن ہماری عطاؤں کا سلسلہ بڑھتا رہے گا۔ جب عطاؤں میں کمی نہیں آسکتی اسی طرح تقسیم میں بھی کمی یا رکاوٹ نہیں آنی چاہیے۔ چنانچہ ابدالآباد تک ذات محمدی ﷺ کی یہ دونوں نسبتیں (نسبت الی الخالق۔۔۔ جو حصول فیضان سے عبارت ہے اور نسبت الی الخلق۔۔۔ جو تقسیم فیضان سے عبارت ہے) قائم و دائم رہیں گی۔ اس لیے قرآن کے پیغام ابدی کے ساتھ ساتھ مخلوق خدا کے لیے اسم مقدس ﷺ کا فیضان وساطت و رسالت بھی جاری و ساری

رہے گا۔

حرفِ جار کی نسبت ایک لطیف نکتہ:

یہاں یہ امر بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ تسمیہ میں کلمہ اسم کو حرف جار (باء) سے منسلک کیا گیا ہے ''جر'' کے معنی کشش اور جذب کرنے کے ہوتے ہیں۔حرف جار کشش کے لیے مقرر ہے چونکہ حرف جار فعل مخدوف کو اسم سے ملانے کے لیے واقع ہوا ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو بھی ذات حق کا ماسوی ہے اور اسے ذات باری تعالیٰ کا قرب و وصال اور معرفت واعانت مطلوب ہے۔وہ ذات محمدی ﷺ سے جسے بطور علامت عنوان ''اسم'' کے تحت بیان کیا گیا ہے جذب وکشش پیدا کرلے۔اسے جس قدر ذات محمدی ﷺ کا قرب اور جذب وکشش نصیب ہوگی اسی قدر ذات حق کی محبوبیت کا سزاوار ہوتا چلا جائے گا۔

جیسے کہ ارشاد خداوندی ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ (آل عمران ۳:۳۱)	(اے حبیب!) آپ فرمادیں اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو تب اللہ تمہیں (اپنا) محبوب بنا لے گا۔

نبی اکرم ﷺ نے اپنی اسی شان کریمی کا ذکر کرتے ہوئے یوں فرمایا:

مثلي كمثل رجل استوقد ناراً فلما أضاء ت ماحولها جعل الفراش و هذه الدوآب التي في النار يقعن فيها و جعل يحجزهن و يغلبنه فيتقحمن فيها قال فذلكم مثلي و مثلكم أنا أخذ بحجركم عن النارهلم عن النارهلم عن النار فتغلبوني و تقحمون فيها ۔ (صحیح مسلم، ۲:۲۴۸، ۴۳۔ کتاب الفضائل،۶۔ باب شفقتہ ﷺ علی امتۃ رقم:۱۸)	حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا میری مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے آگ جلائی اور جب اس آگ نے ماحول کو روشن کردیا تو اس میں پروانے اور حشرات الارض گرنے لگے وہ شخص ان کو آگ میں گرنے سے روکتا ہے اور وہ اس غالب آکر آگ میں دھڑا دھڑ گر رہے ہیں پس یہ میری مثال اور تمہاری مثال ہے میں تمہاری کمر پکڑ کر تم کو جہنم میں جانے سے روک رہا ہوں اور کہہ رہا ہوں کہ جہنم کے پاس سے چلے آؤ اور تم لوگ میری بات نہ مان کر جہنم میں گرے جارہے ہو۔

اس حدیث کے ذریعے اس جذب وکشش کی ماہیت بھی واضح ہوگئی جو کلمہ کے باعث

اسم مقدس میں پیدا ہوگئی تھی۔ اسم نحوی کا خاصہ جر من حیث الوقع ہے اور اسم الٰہی کا خاصہ جر من حیث الصدور ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے ذریعے باری تعالیٰ نے ''توحیدِ خالص'' کی تعلیم دی لیکن اس کی صحت وقبولیت کی شرط بھی متعین فرمادی اور وہ شرط واسطہ رسالت محمدی ﷺ ہے۔ اسی لیے اسم ذات ''اللہ'' کو علی التخصیص الرحمٰن الرحیم کے ذریعے صفتِ رحمت سے اجاگر کیا تاکہ ''شانِ اسمیت'' کے معنی ومفہوم پر بھی دلالت ہوجائے کہ اسمِ مقدس کا کامل ترین مدلول ذات محمدی ﷺ ہے۔